منیر نیازی کی نظم اور وجودیت

سید شبیر حسین بخاری
لیکچرار اردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، گوجرانوالا

MUNIR NIAZI'S VERSE AND EXISTENTIALISM

Syed Shabbir Husain Bukhari
Lecturer in Urdu
Govt. Post Graduate Islamia College, Gujranwala

Abstract

Munir Niazi is one of the leading modern Urdu poets. He is prominent among his contemporaries. His individuality pivots on his keen interest and observation of issues related to modern age. He is not a follower of the trends set by others rather he crushes them to tread his own way. He does not compromise his individuality as well as his liberty which can visibly be traced in his verse. Since he has comprehensive understanding of issues, confusions and complexes faced by modern man, he has addressed them in a befitting way. Munir Niazi's poetic views are influenced with different shades of existentialism. The article tries to relate Munir's views expressed in his poetry with existentialism.

Keywords:

ژاں پال سارتر، ابھیمان، منیر نیازی، وجودیت، غزل، نظم، فلسفہ

منیر نیازی (۱۹۲۸ء۔۲۰۰۶ء) جدید نظم گو شعرا میں منفرد شاعر ہیں ۔ان کا یہ انفراد، جدید عہد (جو صنعتی انقلاب کا زائیدہ ہے) کے انسانی مسائل سے گہری دلچسپی سے تشکیل پاتا ہے۔منیر نیازی معاصر ادبی بہاؤ میں بہہ جانے والے شاعر نہیں، وہ روایتی عناصر کو اپنی بغاوت سے کچلتے اور اپنی آزادیٔ عمل کو بروئے کار لاکر اپنا تشخص مستحکم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔منیر کا شعری کینوس جدیدیت کے تشکیل کردہ منظر نامہ کے بیشتر رنگ لیے ہوئے ہے۔انھوں نے اپنے شعری تجربات (غزل اور نظم) میں جدید عہد کے انسان کے مسائل پر بات کی ہے۔وہ اس جدید صورت حال کا گہرا ادراک رکھتے تھے،جس میں انسانی ہستی گھری ہوئی ہے۔

جدیدیت کی ادبی تحریک نے انسانی زندگی کے تغیرات کو اساس بنا کر اس کے مسائل سے گہرے شغف کا اظہار کیا اور سائنس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ان مسائل کو سلجھانے کا بیڑہ اٹھایا۔بشر مرکزیت (Humanism) کے رویے نے انسانی علوم کے نئے در وا کیے۔ بہت سی نئی تحریکوں اور فلسفوں نے جنم لیا جن کا مرکز و محور انسان تھا۔انھی تحریکوں میں ایک تحریک وجودیت بھی تھی جو دوسری عالمی جنگ کے بعد ابھر کر سامنے آئی۔سورین کیر کے گارڈ اس تحریک کے بنیاد گزار اور ژاں پال سارتر اس کے روح رواں تھے۔علاوہ ازیں مارٹن ہائیڈ گر،فریڈرک نطشے ،کارل جیسپر ز ،البرٹ کامیو سمیت دیگر مفکرین اور فلاسفی بھی اس تحریک کا حصہ رہے۔وجودیت کی تحریک نے اس عہد کے مسائل پر سنجیدہ علمی ڈائیلاگ قائم کیا جس سے ہر زبان کے ادیب متاثر ہوئے چونکہ یہ اس عہد ہی کے مسائل تھے لہٰذا اثر پذیری فطری تھی۔

وجودیت کی تحریک انسان کی کھوئی ہوئی عظمت کی متلاشی تھی ۔وجودیت کی تحریک نے تا بمقدور انسان کو موضوع سخن بنایا اور تمام طرح کے جبر مذہبی ، سائنسی ، صنعتی ، معاشرتی وغیرہ سے انسان کو آزادی کی نوید سنائی ۔اس تحریک کا منشا ایسا آزاد و خود مختار انسان تھا پوری کائنات جس کی مطیع ہو۔انسان اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور معاصر دنیا اسی کی کاوشوں سے مزین ہے ۔ورائے انسان کوئی ہستی نہیں جو اس کے معاملات میں دخیل ہو۔

وجودیت کی تحریک جس انسانی عظمت کے ترانے گاتی ہے منیر کے ہاں وہی عظمت دکھائی دیتی ہے۔ منیر کے ہاں 'انسان' مکمل آزاد اور صاحب قدرت ہے۔وہ انسان جو کائنات کو اپنے ڈھب پر تسخیر کرتا اور فطرت کے دھاروں کو بدلنے کی قدرت رکھتا ہے۔ایسا انسان جو طاقت کا سر چشمہ ہے۔

ہر ایک جانب خزاں کی آواز گونجتی ہے
ہر ایک بستی کشا کش مرگ و زندگی سے نڈھال ہو کر
مسافروں کو پکارتی ہے کہ۔۔۔''آؤ
مجھ کو،خزاں کے بے مہر، تلخ احساس سے بچاؤ''(۱)

بلاشبہ یہ وہی انسان ہے جس پر وجودیت اصرار کرتی ہے اور جسے نطشے 'فوق الانسان' کے نام سے پکارتا ہے۔ ایسا انسان جو کائنات کو اپنے ڈھب پر اتارنے میں مکمل آزاد ہے۔ کسی طرح کی بے بسی اور لاچاری اس کے آڑے نہیں آتی۔ اپنی مرضی ومنشا کے مطابق ''کن کن'' کی صدائیں لگاتا ہے۔ یہ انسان مکمل آزادی کے ساتھ مصروفِ عمل ہے:

میں بھی دل کے بہلانے کو کیا کیا سوانگ رچاتا ہوں
سایوں کے جھرمٹ میں بیٹھا سکھ کی سیج سجاتا ہوں
بجھے جلتے دیپک سے سپنوں کے چاند بناتا ہوں
آپ ہی کالی آنکھیں بن کر اپنے سامنے آتا ہوں
آپ ہی دکھ کا بھیس بدل کر ان کو ڈھونڈنے جاتا ہوں (۲)

وجودیت کا ماننا ہے کہ انسان کا وجود اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ یہی انسانی وجود اس بے معنی کائنات میں معنی پیدا کرتا ہے۔ منیر اس نظم میں اس حقیقت سے متفق نظر آتے ہیں کہ یہ کائنات مظاہر انسانی کا پرتو ہے اور البرٹ کامیو کی ''لغو دنیا'' کو نطشے کا فوق الانسان ہی معنویت دے سکتا ہے۔ سنگ وخشت سے دنیائیں نہیں پیدا ہوا کرتیں بلکہ اس کے لیے جیتے جاگتے ''میں'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''میں'' کا یہ سلسلہ مختلف روپ دھارنے تک نہیں رکتا بلکہ بتدریج ارتقائی منازل طے کرتا اس مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں کائنات کو اپنے ڈھب میں ڈھالنے کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔ اس مقام پر منیر خود سے مشاورت کرتے دکھائی دیتے ہیں:

بدلنا چاہتا ہوں اس زمیں کو
یہ کارِ آسماں کیسے کروں میں (۳)

یہاں التباس ہوسکتا ہے کہ شاید شاعر خود میں اتنی ہمت مجتمع نہیں کر پا رہا اور مایوس ہو گیا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ ایک ایسا انسان جس میں یہ سب کرنے کی اہلیت نہ ہو اس کے ذہن میں ایسا خیال نہیں آسکتا اور پھر زمین کو بدلنے کی خواہش بھی غماز ہے کہ شاعر سمجھتا ہے کہ کائنات کو بدلا جاسکتا ہے۔ ایسی کوئی ماورائی طاقت نہیں جو اس امر میں رخنہ انداز ہو کیونکہ انسان مطلق آزاد ہے۔ انسان اس کائنات کی سب سے طاقتور ہستی ہونے کے سبب اپنا خدا آپ ہے۔ اس دعویٰ کی دلیل منیر کی نظم ''شہر آشوب'' ہے:

یوں نہ مرکز کے لیے بے چین پھرتا میں کبھی
پیکرِ سنگیں سہی اپنا خدا ہوتا کوئی (۴)

پس طے ہو گیا کہ ہر انسان نے اپنی صلیب خود اٹھانی ہے۔ یہاں کوئی رہبر نہیں جو اسے مرکز کا پتہ دے یا اس کی رہ نمائی کرے بلکہ سب سے اہم اس کا اپنا وجود ہے۔ کامیو کی 'لغو دنیا' میں بے مقصد پھینکا گیا

انسان جب اپنی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے نطشے کے 'فوق البشر' کا روپ دھار لیتا ہے تو پھر یہ کائنات اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ یہ تپسیا بڑی جان کاہ ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب انسان پکار اٹھتا ہے:

شبھ دن آئے پریتما
اپنی تپسیا کے آگے
سب دکھ ہار گئے (۵)

انسان کی باشعور آزادی نے اسے عظمت کے اعلیٰ مقام پر جا بٹھایا۔ ایسی مثال شاید انسانی تاریخ میں نہ ملے لیکن اس مقام تک پہنچنا کتنی صعوبتوں کا ثمر ہے' منیر اس کا بھی پوری طرح ادراک رکھتے ہیں جس کا اظہار ان کی نظم میں متعدد مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے۔

میرے سوا اس سارے جگ میں کوئی نہیں دل والا
میں ہی وہ ہوں جس کی چِتا سے گھر گھر ہوا اجالا
میرے ہی ہونٹوں سے لگا ہے نیلے زہر کا پیالہ
میری طرح کوئی اپنے لہو سے ہولی کھیل کے دیکھے
کالے کٹھن پہاڑ دکھوں کے سر پر جھیل کے دیکھے (۶)

منیر اس نظم میں اپنی ''میں'' کا ذکر کر رہے ہیں جو اصل میں ان کی انفرادیت ہے۔ ساتھ ساتھ ان کٹھن مراحل کا بیان ہے جن سے گزر کر اس ''میں'' کا حصول ممکن ہوا۔ اس نظم میں شاعر ایک ایسے باغی کے روپ میں دکھ رہا ہے جو روایت اور مروجہ دستورِ زندگی سے بغاوت کر رہا ہے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ بغاوت، ہمت اور جرات کی متقاضی ہے تو جب انسان اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے تو پھر ڈر اور جھجک کیسی؟ لیکن یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ یہ بغاوت، 'مریضانہ بغاوت' ہرگز نہیں بلکہ یہ بغاوت سراسر مثبت ہے جس سے اجالے جنم لے رہے ہیں۔ سارتر کے افسانہ ''ایروس ترے تس'' کا مرکزی کردار یہ سوچتا ہے کہ:

''اپنی ذات کے اختتام پر ایک دن میں بھی دھماکے کے ساتھ پھٹوں گا اور دنیا کو اس لشکارے سے منور کروں گا جو بجلی کے تار کی طرح مستعجل اور شدید ہوگا۔'' (۷)

منیر کی اس نظم میں ظاہر ہونے والی بغاوت کے پیچھے سارتر کے ''نظریہ آزادی'' اور ''انتخاب فیصلہ'' کے نظریات کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ زہر کے پیالے کا انتخاب اور اپنے لہو سے ہولی کھیلنے کا فیصلہ سراسر شاعر کا ذاتی فیصلہ ہے لیکن اسی انتخاب فیصلہ کی آزادی نے شاعر کی 'انفرادیت' کو جنم دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہی انفرادیت فرد کا تشخص ہے جو وجودیت کو بہت عزیز ہے اور منیر کو بھی۔ یہی سبب ہے کہ ایسے تمام امور جن سے انفرادیت پہ زد پڑتی ہے اور اجتماعیت کے سمندر میں غرق ہونے کا احتمال پیدا ہوتا ہے، منیر ان سب سے بیزار نظر آتے ہیں چاہے وہ مذہب ہو یا اقدار۔

درخت مستی میں جھومتا ہے/ اسے نہ چھیڑو، اسے نہ چھیڑو
کبھی نہ اس کے قریب جانا/ کہ اس کا پھل موت ہے ہمیشہ
اسے بس اپنے اکیلے پن میں / اداس رہنے دو، جھومنے دو
ہمیشہ اک جیسے رات دن کے/ اجاڑ مدفن میں گھومنے دو (۸)

اجتماعیت ایسا سانچہ ہے جس میں ڈھلتے ہی فرد اپنی فردیت/تشخص کھو بیٹھتا ہے۔ وجودیت کی تحریک ہر نوع کی اجتماعیت کی منکر ہے کیوں کہ اجتماعیت، انفرادیت کو نگل جاتی ہے۔ منیر کو اپنی انفرادیت/تشخص شاعری کے ساتھ ساتھ ذاتی زندگی میں بھی بہت عزیز رہا۔ شاید یہی سبب ہے کہ مشرقی اقدار کے برعکس منیر اسلاف کے شعار کو غلط قرار دیتے ہوئے روایت سے انحراف کا اعلان کرتے ہیں:

میں غلط روایتوں کا
اچھا وارث ثابت نہیں ہوا (۹)

اس مختصر ترین نظم میں منیر کے ہاں اس باغیانہ رویے کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو خالصتاً وجودی رویہ ہے۔ جیسے ہی فرد انتخاب فیصلہ کی آزادی استعمال کرتے ہوئے ماقبل روایتوں کا احتسابی مطالعہ کرتا ہے تو اس پر کھلتا ہے کہ روایت تو نام ہی انفراد کے انہدام کا ہے۔ یہ ادراک جدید ذہن پر شاق گزرتا ہے جسے وہ کسی طور قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو پاتا۔ منیر بھی اسی طرح کی صورت حال سے دوچار ہیں۔ وہ جان چکے کہ روایت کی پیروی میں ذات کے اظہار کی گنجائش ذرا کم ہی نکلتی ہے لہٰذا وہ برملا اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ غلط روایتوں کے اچھے وارث ثابت نہیں ہوئے کیوں کہ انھیں اپنی ذات بہت عزیز ہے۔ ذات کا یہی اظہار انھیں انفرادیت بخشتا ہے جو انھیں لاکھوں کے ہجوم میں تنہا رکھتا ہے اور اجتماع میں گم نہیں ہونے دیتا:

لاکھوں شکلوں کے میلے میں تنہا رہنا میرا کام
بھیس بدل کر دیکھتے تیز رہنا ہواؤں کا کہرام
بن گیا قاتل میرے لیے تو اپنی ہی نظروں کا دام
سب سے بڑا ہے نام خدا کا اس کے بعد ہے میرا نام (۱۰)

انسانوں کے انبوہ میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کا فن منیر خوب جانتے ہیں۔ ''بن گیا قاتل میرے لیے تو اپنی ہی نظروں کا دام'' کے مصرع میں اپنی ہی نظروں کا دام سے مراد وہ موضوعیت ہے جس پر وجودیت کا اصرار ہے۔ سچائی کو جانچنے کا پیمانہ فرد ہے اور فرد کی موضوعیت فرد کے آزادانہ فیصلہ انتخاب سے جھلکتی ہے۔ فرد ازل سے آزاد ہے کیوں کہ کسی طرح کا جبر اس کی آزادی میں مانع نہیں ہے سوائے اس کی آزادی کے۔ سارتر کے مشہور ڈراما ''مکھیاں'' میں دیوتا زیس بھی بالآخر انسان کی آزادی کو تسلیم کر لیتا ہے:

''زیس: ہم دونوں اس تلخ حقیقت سے باخبر ہیں کہ انسان ازل سے آزاد ہے۔ہاں آیجئس تھیٹس!
لوگ آزاد ہیں۔تمھیں اس راز کا علم ہے لیکن تمھارے عوام اس سے باخبر نہیں۔''(۱۱)

انسان کی یہ آزادی ہی اس کے لیے بڑا عذاب ہے جس سے وہ چھٹکارا نہیں پا سکتا۔یہ آزادی، انسان پر مسلط کر دی گئی ہے۔انسان کو ہر صورت انتخاب فیصلہ کے کٹھن مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔یہ انتخاب فیصلہ ہی ہے جو انسان میں کرب کا احساس پیدا کرتا ہے۔اسی سبب منیر اپنی نظروں کے دام کو اپنا قاتل قرار دے رہے ہیں۔اس مشکل مرحلہ سے نپٹنے کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جب منیر خدا کے بعد اپنے نام کی بڑائی کا اعلان کرتے ہیں۔یہاں مذہبی وجودیت کے نقوش نمایاں ہوئے ہیں جو سورین کیر کے گارڈ کے مکتبہ فکر سے متعلق ہے۔

منیر نے زندگی کے کسی بھی مرحلے اور کسی بھی صورت حال میں اپنی انفرادیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کی نظم ''خرابی میں خوبی'' دیکھیے:

رابطوں، رشتوں میں الجھن تھی بہت
اس نظام شہر میں رہنے کی ہمت ہی نہ کی
لفظ یہ لوگوں میں رائج تھا بہت
اس لیے اس شہر میں ہم نے محبت ہی نہ کی (۱۲)

منیر کی اس نظم کے پہلے مصرع میں وجودی صورت حال پوری طرح موجود ہے۔مارٹن ہائیڈگر کے مطابق ہماری زندگیوں میں دکھ ان لوگوں کی وجہ سے آتے ہیں جو مختلف رشتوں کی شکل میں ہم سے جڑے ہوتے ہیں۔سارتر کے افسانے کا ایک کردار تو چلا اٹھتا ہے:

''جہنم نام۔۔۔۔۔دوسرے لوگوں کا''(Hell is Others)(۱۳)

سارتر کا ڈراما ''اندھی گلی'' اسی موضوع کے گرد گھومتا ہے۔وجودیت کا فلسفہ ہر طرح کے نظام کی نفی کرتا ہے کیوں کہ نظام، فرد کی انفرادیت کا قاتل ہے۔منیر کی اس نظم میں بھی معروضیت کی نفی کی گئی ہے۔انفرادیت پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کرتے ہوئے روایت سے بغاوت کر دی گئی ہے اور تشخص برقرار رکھا گیا ہے۔منیر اس نظم میں جس انفردیت کا پرچار کرتے ہیں اور عملی زندگی میں بھی اپنائے ہوئے ہیں، اسی انفرادیت کی کوکھ سے تنہائی (Alienation) جنم لیتی ہے۔یہ تنہائی ہے جو فرد کو اداس و تنہا کر دیتی ہے نتیجتاً فرد خارجی دنیا سے بتدریج کٹتا چلا جاتا ہے۔جیسے ہی فرد کا تعلق خارجی دنیا سے کمزور ہونا شروع ہوتا ہے تو اس پر باطنی دنیا کے در وا ہونے لگتے ہیں۔خارجی اور داخلی کائنات میں بڑھتا ہوا بُعد فرد کو مزید مغموم کر دینے کے ساتھ ساتھ اس کی تنہائی کے احساس کو دو چند کر دیتا ہے۔منیر بھی تنہائی کے اس جان کاہ عذاب سے دوچار ہیں:

سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستا نہیں

ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں (۱۴)

جدید عہد جو صنعتی انقلاب سے آراستہ ہے، میں فرد کی آواز انسانوں اور مشینوں کے ہجوم اور شور میں کہیں زیریں سطح چلی جاتی ہے اور ردِ عمل میں وہی تنہائی جسے فرد روزِ اول سے جھیل رہا ہے شدت اختیار کر جاتی ہے۔دھیرے دھیرے کائنات کے سارے حسین مناظر اپنی رعنائیاں کھونے لگتے ہیں اور ان کی تہہ سے بھیانک تنہائی نمودار ہوتی ہے۔تنہائی کا ایک سبب ہر انسان کا اپنی ذات میں ایک دنیا ہونا بھی ہے جو ہر حوالہ سے دوسروں سے مختلف ہے اور یہی اختلاف ذات اس کا تشخص ہے۔اس دنیا کی بنیاد ہی اختلاف عمل پر ہے۔منیر بھی اس کائنات میں اپنی مثال آپ ہیں۔جیسے ہی منیر کو یہ احساس ہوتا ہے، ان کی تنہائی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے اور ایسی صورت حال میں عافیت اور بقا باطن میں ہی معلوم پڑتی ہے۔منیر 'دروں بینی' کے اس سفر کو ساتواں در کھلنے سے موسوم کرتے ہیں:

ڈوب چلا ہے زہر میں اس کی آنکھوں کا ہر روپ
دیواروں پر پھیل رہی ہے پھیکی پھیکی دھوپ
سناٹا ہے شہر میں جیسے ایسی ہے آواز
اک دروازہ کھلے گا جیسے کوئی پرانا راز (۱۵)

نظم کا مصرع ''ڈوب چلا ہے زہر میں اس کی آنکھوں کا ہر روپ'' سے مراد وہ رشتے ناطے ہیں جو انسان زندگی گزارتے ہوئے اپنے ساتھ پروان چڑھائے رکھتا ہے اور اپنے تئیں خیال کرتا ہے کہ زندگی میں معنویت انھی رشتوں ناطوں کے سبب ہے لیکن پھر اک دم اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جیسے سارتر کے کردار پر ہوتی ہے کہ ''دوسرے جہنم ہیں''۔اس مصرع کی دوسری ممکنہ تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ زندگی کی رنگینیاں شاعر کے سامنے اپنی معنویت کھو رہی ہیں اور ان کا کھوکھلا پن اس پر آشکار ہونے لگا ہے۔ہر دو صورتوں میں اس تلخ حقیقت کے انکشاف کے ساتھ ہی تمام تر خارجی انسلاکات پھیکے محسوس ہونے لگتے ہیں۔جب یہ حقیقت دل و دماغ میں پوری طرح سرایت کر جاتی ہے تو انسانوں سے بھرپور شہروں اور بستیوں میں ایک ہولناک سناٹے کا احساس جاگتا ہے۔اس احساس سے ڈر کر منیر ساتواں در کھلنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔اصل میں یہ ساتواں در' منیر کی اپنی ذات ہی ہے جس سے وہ ملاقات اور ہمراہی کے خواہاں ہیں۔یوں خارج کی تنہائی کو داخلی معاملات سے پاٹنے کی شعوری کاوش دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ صرف منیر ہی نہیں بلکہ ہر انسان کا المیہ ہے کہ اس بھری دنیا میں وہ اکیلا اور تنہا ہے۔لاکھ پکارو، ہزار ڈھونڈو لیکن نتیجہ مایوسی ہے، جو اکلاپے کے صدمہ کو دوآتشہ کر دیتی ہے۔منیر اپنے جیسے لوگوں کے متلاشی

ہیں مگر یہ سفر لاحاصلی کا سفر ہے:

کچھ اپنے جیسے لوگ ملیں/ ان رنگ برنگے شہروں میں
کوئی اپنی جیسی لہر ملے/ ان ساپنوں جیسی لہروں میں (١٦)

ہزاروں طرح کے رشتوں میں تنہا رہنا یقیناً اک عذاب ہے اور منیر نہ صرف اس عذاب سے دوچار ہیں بلکہ پوری شدت سے اسے محسوس بھی کرتے ہیں۔ تنہائی اور اکلاپے کا دکھ جدید عہد کے ہر فرد کا دکھ ہے۔ منیر اپنے عہد کے انسان کا المیہ بیان کرتے ہیں جو ان کی نظم میں متعدد مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے:

ساتھ اپنے جمگھٹا لگا کر
آپ اکیلا پھرتا ہوں (١٧)

زندگی کے طویل اور لامتناہی راستے پر چلتے چلتے مغائرت کا احساس اور بڑھ جاتا ہے جب آپ کے ساتھ صرف تنہائی ہو۔ آپ کے ساتھ تنہائی ہو اور دور دور تک کوئی سہارا نہ ہو۔ زندگی کی ویران اور تاریک راہوں میں بجلی چمکے بھی تو صرف یہ احساس دلانے کے لیے کہ آپ تنہا ہیں۔ تب فرد اس کائنات سے جس طرز کی نامانوسی اور غیریت محسوس کرتا ہے وجودیت اسے موضوع بناتی ہے۔ ایسے سفر میں تھکن کا احساس دوچند ہو جاتا ہے دیکھیے منیر اس پر کیا کہتے ہیں:

آس پاس کوئی گاؤں نہ دریا اور بدریا چھائی ہے
شام بھی جیسے کسی پرانے سوگ میں ڈوبی آئی ہے
پل پل بجلی چمک رہی ہے اور میلوں تنہائی ہے (١٨)

تنہائی کا موضوع منیر کی نظم میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے جو جدید عہد کے فرد کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ مارٹن ہائیڈ گر نے کہا تھا:

''بالقوہ وجود کے طور پر انسان ایک ہی راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں۔ وہ انتخاب کر سکتا ہے اور اس کے سامنے دو راستے ہیں۔ وہ یا تو عوام الناس میں گھل مل کر انفرادیت سے محروم ہو جائے یا ذاتی ذمہ داری و خودمختاری سے اپنی راہ تلاش کرے۔ پہلی صورت میں اس کی زندگی بے معنی و غیر حقیقی ہوگی اور دوسری صورت میں بامعنی و حقیقی۔'' (١٩)

منیر نیازی نے موخر الذکر راستہ اختیار کیا۔ زندگی کو ذمہ داری اور خودمختاری سے بامعنی بنایا لیکن تنہائی کے کرب سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ منیر کی شاعری سے عمومی تاثر ملتا ہے کہ وہ ذات کے کرب میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ یہ کرب ان کا ذاتی فیصلہ ہے مگر پھر بھی وہ آرزو کرتے ہیں:

میں منیر آزردگی میں اپنی یکتائی سے ہوں
ایسے تنہا وقت میں ہم دم مرا ہوتا کوئی (٢٠)

ہمدم کی عدم موجودگی انھیں ملول کر جاتی ہے لہٰذا ’حزن‘ کا در آنا فطری ہے لیکن منیر اس تلخ حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ حزن تو پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنی ذات میں‘ دکھ کے کرب میں مبتلا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز بھی اس سے ورا نہیں ہے۔ کائنات بالعموم اور انسان بالخصوص دہشت کے حصار میں ہیں اور یہ کائنات ایک زندان ہے۔

اپنے اپنے دائرے میں ہر کوئی بے چین ہے
گرد باد یاس و غم میں گم ہے یہ کون و مکاں (۲۱)

وجودیت کا فلسفہ زندگی کو ’’دعوت مبارزت‘‘ کی صورت قبول کرتے ہوئے انسان کو مکمل آزادی فراہم کرتا ہے لیکن انسان تو دہشت اور کرب کا شکار ہے۔ یہی کرب اور دہشت انسان سے غلط فیصلوں کا ارتکاب بھی کرواتے ہیں جسے سارتر 'Bad Faith' کا نام دیتا ہے۔ اسی 'Bad Faith' سے ’ناراضی‘ (Anguaish) اور ’بیزاریت‘ (Anxiety) پیدا ہوتی ہے۔ البرٹ کامیو کے مطابق زندگی اور زندگی بتانا دونوں ہی کارِ لایعنی (Absurdity) ہے۔ اس کارِ لایعنی کو بامعنی بناتے ہوئے انسان بار ہا غصہ، اکتاہٹ اور بیزاری کا شکار ہو جاتا ہے۔ منیر بھی اس صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں:

بس مرا چلتا نہیں جب سختیٔ ایام پر
فتح پا سکتا نہیں جب یورش آلام پر
اپنے ان کے درمیاں دیوار چن دیتا ہوں میں
اس جہان ظلم پر اک خواب بن دیتا ہوں میں (۲۲)

پوری کائنات لایعنیت کا پرتو لیے ہوئے ہے، خود انسانی وجود بے معنویت کا عذاب جھیل رہا ہے۔ وجودی فلسفہ کے مطابق چونکہ انسان کا کوئی مقصد نہیں لہٰذا اس کا ہونا تکلیف دہ ہے۔ ساری زندگی وہ اس دکھ کو اٹھائے پھرتا ہے اور پھر موت بذات خود ایک دکھ ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو وجود کا ہونا آزادی کا ثبوت بھی ہے جس سے مفر نہیں۔ یہ آزادی ایک قید ہے اور اس عذاب دہ آزادی سے جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔ انسان عدم سے عدم کی جانب رواں ہے، استحکام چاہتا ہے، تشخص اور پھر اس تشخص کا استقلال چاہتا ہے لیکن موت تمام امکانات کے خاتمے کا اعلان کر دیتی ہے اور پھر یوں سب کچھ لغو قرار پاتا ہے:

ہونے کا غم اسے بھی ہے/ اور مجھ کو بھی
کبھی نہ ہونے کا اندیشہ/ اسے بھی ہے اور مجھ کو بھی (۲۳)

منیر کائنات کی لغویت کا پوری طرح ادراک رکھتے ہیں۔ کامیو کے مطابق تو اس لغو کائنات پر غور و فکر کرنا بھی کارِ لغو ہے۔ عناصرِ کائنات اپنے ساتھ لغویت کا شدید احساس لیے ہوئے ہیں اور یہی سبب ہے

کہ یہ ہر طرح کے نصب العین یا آدرش سے محروم ہے۔ وجودی فلاسفروں کے نزدیک ان تمام عوامل کے معانی صرف وہی ہیں جو ہم انھیں دیتے ہیں کیونکہ انسان سے ورا تو کوئی ہستی نہیں جو انھیں معانی دے سکے لہٰذا تمام کائنات کارلا حاصل میں مشغول ہے۔ منیر کی نظم میں بھی یہ احساس موجود ہے:

ابھی چاند نکلا نہیں/ وہ ذرا دیر میں ان درختوں کے پیچھے سے ابھرے گا
اور آسماں کے بڑے دشت کو/ پار کرنے کی کوشش کرے گا (۲۴)

منیر کی یہ نظم ''اسطور سسی فس'' (Myth of Sisyphus) کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ جس طرح سسی فس کو دیوتاؤں نے غضب ناک ہو کر پتھر کو بلند پہاڑوں پر لے جانے کی سزا دی تھی۔ اب وہ پتھر کو لے کر جوں ہی پہاڑ کی بلندیوں پر پہنچتا، پتھر نیچے لڑھک جاتا اور وہ بار بار یہی عمل دہراتا اور ہر بار ناکام رہتا۔ کچھ ایسی ہی کوشش رائیگاں میں چاند جتا ہوا ہے۔ روزانہ کی کوشش کے باوجود ناکامی اس کا مقدر بنتی ہے۔ انسان اور کائنات کے دیگر عوامل چونکہ لغویت پر قابو نہیں پا سکتے نتیجتاً انھیں بھی سسی فس جیسی بے سود کوششوں کا دکھ اٹھانا پڑ رہا ہے:

بارِ ہستی ہی بہت تھا بستیوں کی زیست میں
نیستی کے خوف کو بھی خواہش دل کر لیا (۲۵)

منیر کے ہاں اس آزردگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو لغویت اور رائیگانی کو لیے ہوئے ہے۔ اس لغو کائنات میں لغو وجود ہی کافی تھا کہ ساری زندگی لغویت پر قابو پانے کی سبیلوں پر غور و فکر کرنے میں ضائع کر دی جاتی اور اس پر نیستی کا خوف، ختم ہو جانے کے اندیشے نے زندگی اور اس کے متعلقات سے معنویت کو یکسر ختم کر دیا۔

برسوں تنہائی میں رہ کر / جب میں شہر میں آتا ہوں
بدلا بدلا دیکھ کے اس کو/ پھر واپس ہو جاتا ہوں (۲۶)

مغائرت اور اجنبیت کا احساس بے معنویت کو جنم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منیر اس کائنات سے موافقت اختیار نہیں کر پا رہے۔ انسان کی دیگر انسانوں سے مغائرت (جو بالعموم شہری زندگی کا چلن ہے) انسان کو اجنبیت کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے اور لغویت کا احساس شدید ہو جاتا ہے اور پھر منیر بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

یہی واقعات ہیں کچھ یہاں/ بڑے مختصر، بڑے دیرپا
کہ اثر سے جن کے بھری رہی/ یہ بغیر معنی کے زندگی (۲۷)

منیر کی مذکورہ نظم، جو بغیر عنوان کے ہے، اپنے اندر بے معنویت کا گہرا احساس لیے ہوئے ہے۔ عنوان کا نہ ہونا بھی اپنے اندر پُر اسرار ہے اور یہ اسرار کھولیں تو لغویت اور بے معنویت کا منظر نامہ تشکیل پاتا ہے۔ نشان خاطر رہے منیر، لغویت کے اس سیل میں مکمل طور پر بہہ گئے ہوں، ایسا ہرگز نہیں بلکہ لغویت کا احساس جز وقتی ہے۔ جیسا کہ وجودی مفکرین کا ماننا ہے کہ زندگی مختلف النوع صورت احوال کا مجموعہ ہے لہٰذا

کوئی نظام یا آفاقی اصول فرد کی رہنمائی نہیں کرسکتا کیونکہ زندگی بتانا موضوعی عمل ہے اور معروضیت کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔لغویت اور رایئگانی کا احساس بھی ایک صورت حال ہے جس سے ہر باشعور فرد کا واسطہ پڑتا ہے۔منیر بھی اس صورت حال سے دو چار ہوتے ہیں لیکن پھر وہ اس صورت حال سے جلد نکل آتے ہیں۔وہ آزادی کو استعمال کرتے ہوئے اپنی ذات پر ارتکاز کرتے ہیں اور ایک طاقتور انسان (جسے نطشے سپر مین سے تعبیر کرتا ہے) کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔منیر ایسے انسان کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں جو ذمہ داری سے اپنی آزادی کو بروئے کار لاتا ہے تو یہ کائنات اور اس کے انسلاکات اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔وہ جیسی تبدیلی چاہے لا سکتا ہے اور جیسی معنویت چاہے ان کو پہنا سکتا ہے۔ساری کائنات اس کے سامنے سرنگوں دکھائی دیتی ہے:

جب میرا جی چاہے میں جادو کے کھیل دکھا سکتا ہوں
آندھی بن کر چل سکتا ہوں بادل بن کر چھا سکتا ہوں
ہاتھ کے اک اشارے سے پانی میں آگ لگا سکتا ہوں
راکھ کے ڈھیر سے تازہ رنگوں والے پھول اگا سکتا ہوں
اتنے اونچے آسمان کے تارے توڑ کے لا سکتا ہوں (۲۸)

منیر کی اس نظم میں ایک آزاد اور قادر مطلق انسان بول رہا ہے جو حقیقی طور پر نطشے کا فوق البشر ہے۔ ایک ایسا انسان جس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں اور وہ خدائی مسند پر متمکن (وجودیت کے فلسفہ کے مطابق) اپنے خدائی اختیارات استعمال کر رہا ہے۔لیکن یہی آزاد انسان جب فیصلے کرتا ہے تو تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر اسی تذبذب سے حزن جنم لیتا ہے۔ژاں پال سارتر انسانی حزن کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک وجودی بڑی بے تکلفی سے کہتا ہے کہ انسان حزن کا شکار ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب کسی بات کی خود عہدی کرتا ہے تو پوری طرح یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صرف اپنے متعلق ہی کچھ فیصلہ نہیں کر رہا بلکہ ایک قانون ساز کی حیثیت سے تمام نوع انسان کے لیے بھی فیصلہ کر رہا ہے۔ایسے لمحے وہ مکمل اور مطلق آزادی کے احساس سے نہیں بچ سکتا۔بلاشبہ بہت سے ایسے بھی ہیں جو کسی تشویش کا مظاہرہ نہیں کرتے لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ محض اپنا حزن چھپا رہے ہوتے ہیں یا پھر اس سے فرار کی حالت میں ہیں۔''(۲۹)

منیر بھی کئی مقامات پر فیصلہ کرتے وقت اسی تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں جسے سارتر 'حزن' کا نام دیتا ہے:

مگر وقت گزر جاتا ہے اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔(۳۰)

منیر کی معروف نظم ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں'' اس حوالہ سے دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں بھی تذبذب کی وہی فضا ہے جہاں وہ اختیار میں انتخاب پر تذبذب کا شکار ہیں۔ عدم فیصلگی کے سبب وہ ہمیشہ تاخیر کر دیتے ہیں اور کوئی فیصلہ بروقت نہیں کر پاتے۔ منیر کی نظم ''وجود کی اہمیت'' دیکھنے لائق ہے اور وجودیت کے فلسفہ کے متعدد رنگ لیے ہوئے ہے:

تو ہے تو پھر میں بھی ہوں/ میں ہوں تو یہ سب کچھ ہے
دکھ کی آگ بھی موت کا غم بھی/ دل کا درد اور آنکھ کا نم بھی
میں جو نہ ہوتا/ میری طرح پھر کون
جہاں کے/ اتنے غموں کا بوجھ اٹھاتا
دوزخ کے شعلوں میں جل کر/ شعروں کے گل زار کھلاتا (۳۱)

منیر نیازی کی یہ نظم فلسفہ وجودیت سے ہم آہنگ ہے۔ منیر نے نظم کا آغاز ہی وجود کے موجود ہونے سے کیا ہے کہ ''تو ہے تو پھر میں بھی ہوں''۔ وجودیت کا فلسفہ ابتدا سے ہی تجرید کا منکر رہا ہے۔ وہ اس وقت تک کسی چیز کو موضوع گفتگو نہیں بناتا جب تک اس کا وجود ثابت نہ کیا جا سکے۔ نظم کا آغاز وجود کی موجودگی کے اعلان سے ہو رہا ہے۔ نظم کا دوسرا مصرع ''میں ہوں تو یہ سب کچھ ہے'' میں ''میں'' کا ہونا دراصل جوہر ہے۔ سارتر نے کہا تھا وجود، جوہر پر مقدم ہے تو کچھ ایسا ہی معاملہ نظم کے پہلے دو مصرعوں میں ہے کہ وجود ہے تو پھر صاحب وجود بھی ہے اور صاحب وجود کے ہونے سے اس کا جوہر بھی ہے یعنی اس کا جوہر دال ہے کہ کوئی صاحب وجود ہے۔ وجود کے اثبات اور جوہر کے تعین کے بعد نظم آگے بڑھتی ہے۔

''دکھ کی آگ بھی، موت کا غم بھی'' کا مصرع اس دکھ اور کرب کا احساس دلاتا ہے، جس سے انسان خدائی فریضہ سرانجام دیتے ہوئے دوچار ہوتا ہے۔ انسان سے ورا کوئی ہستی تو ہے نہیں لہٰذا انسان فیصلہ کرنے میں آزاد ہے۔ آزاد انسان اپنی زندگی میں بہت سے فیصلے کرتا ہے جن میں سے کچھ درست اور کچھ غلط ثابت ہوتے ہیں۔ یہ غلط فیصلے ہی ہوتے ہیں جو انسان کو دکھ میں مبتلا کر دیتے ہیں، المیہ کا آغاز بھی غلط فیصلے سے ہوتا ہے۔ مارٹن ہائیڈگر کے مطابق انسان بے معنی وجود کو بامعنی بناتے ہوئے کائنات کی دیگر چیزوں سے مدد لیتا ہے لیکن مقصد میں ناکامی اسے دکھ میں مبتلا کر دیتی ہے اور پھر موت! موت تو انسان کا ایسا دائمی دکھ ہے جو اس کے امکانی قویٰ کو ختم کر دیتا ہے اور انسان دہشت کا شکار ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تاثر منیر کی اس نظم کے ان مصرعوں سے ابھر رہا ہے کہ انسان مسلسل کرب میں مبتلا ہے۔ کرب کا یہ سلسلہ نظم کے اگلے مصرعے میں بھی چلتا ہوا دکھائی دے رہا ہے ''دل کا درد اور آنکھ کا نم بھی''۔ وجودیت کے مطابق انسان اس کائنات میں بے مقصد پھینکا گیا وجود ہے۔ بے مقصدیت اور لغویت کا احساس اسے مسلسل دکھ میں مبتلا رکھتا ہے اور پھر انسان سے

منسلک اشیا اور رشتے، جن کی حیثیت مشکوک اور متزلزل رہتی ہے، دکھ اور کرب میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ انسان کا سارا سفر عدم سے عدم تک کا ہے جو دکھ اور کرب سے بھرا ہے اور پھر موت اس پر مہر تصدیق ثبت کر دیتی ہے۔ نظم کے پہلے چار مصرعوں کے بعد منیر اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

میں جو نہ ہوتا/ میری طرح پھر کون
جہاں کے/ اتنے غموں کا بوجھ اٹھاتا
دوزخ کے شعلوں میں جل کر/ شعروں کے گل زار کھلاتا (۳۲)

یہاں سے نظم کا رخ انسان کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس انسان کی طرف جو کائنات کا مرکز و محور ہے، جو اپنا مالک آپ ہے۔ چونکہ انسان آزاد ہے لہٰذا ہر اچھی بری صورت حال کا وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔ ذمہ داری اور جواب دہی کا یہ بوجھ اٹھانا انسان کی مجبوری ہے اور یہی انسان کی آزادی ہے۔ نظم کے آخری دو مصرعوں میں نطشے کے افکار (سپر مین) کی گونج سنائی دیتی ہے جہاں انسان خود تو صعوبتیں برداشت کرتا ہے لیکن فوق الانسان کے لیے راہ ہموار کر دیتا ہے۔ یہاں انسان خود کو اس بھٹی سے گزار رہا ہے جس کے شعلے اس کی تطہیر کر رہے ہیں تا کہ وہ فوق الانسان کے منصب پر فائض ہو سکے۔ وجودیت کے مطابق ہماری آزادی اور فیصلے ہم سے منسلک دوسرے لوگوں کو بھی متاثر کرتے ہیں لہٰذا فیصلہ کرتے وقت انسان کرب کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں شاعر خود تو کرب عظیم میں مبتلا ہے لیکن اس کے فیصلے دوسرے انسانوں کے لیے باعث سکون ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) منیر نیازی، کلیات منیر، ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ''خزاں'' ص ۶۰

(۲) ''میں''، کلیات منیر، ص ۱۰۸

(۳) کار آسماں، کلیات منیر، ص ۶۱۲

(۴) آشوب شہر، کلیات منیر، ص ۶۷۷

(۵) آخر اک دن، کلیات منیر، ص ۶۵۷

(۶) ابھیمان، کلیات منیر، ص: ۱۱۰

(۷) ژاں پال سارتر، ''ایروس ترے تس'' (مترجم شاہد احمد دہلوی) مشمولہ سارتر کے بے مثال افسانے، (مرتبہ فہیم شناس کاظمی) سٹی بک پوائنٹ، کراچی ۲۰۱۲ء، ص ۸۷

(۸) مذہبی کہانیوں کا درخت، کلیات منیر، ص ۲۲۰

(۹) غلط وارث، کلیات منیر، ص ۷۴۷

(۱۰) میں اور میرا خدا، کلیات منیر، ص ۲۱۸

(۱۱) ژاں پال سارتر،''مکھیاں''،(مترجم پرویز عالم)،مشمولہ سارتر کے بے مثال افسانے،محولا بالا،ص۱۶۲

(۱۲) خرابی میں خوبی' کلیات منیر،ص۴۸۷

(۱۳) ژاں پال سارتر،''اندھی گلی''(مترجم شاہد احمد دہلوی)مشمولہ سارتر کے بے مثال افسانے،محولا بالا،ص۲۴۹

(۱۴) میں اور شہر' کلیات منیر،ص۱۸۶ (۱۵) ساتواں در کھلنے کا سماں' کلیات منیر،ص۲۸۶

(۱۶) ساتھیوں کی تلاش' کلیات منیر،ص۲۸۱ (۱۷) آدمی' کلیات منیر'ص۲۸۳

(۱۸) راستے کی تھکن' کلیات منیر'ص۲۰۵

(۱۹) قاضی جاوید،''ہستی کا گڈریا''مشمولہ وجودیت،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۰ء،ص۵۶

(۲۰) آشوب شہر،کلیات منیر،ص۶۷۷ (۲۱) زندان' کلیات منیر'ص۹۰

(۲۲) خواب میری پناہ ہیں' کلیات منیر'ص۵۹۳ (۲۳) ہونے کا غم کس کو نہیں' کلیات منیر'ص۲۹۹

(۲۴) کوشش رائیگاں' کلیات منیر'ص۱۶۱ (۲۵) سہ حرفی' کلیات منیر'ص۶۶۳

(۲۶) ہجرت اور مراجعت کے دوران تبدیلیاں،کلیات منیر،ص۳۳۷

(۲۷) کلیات منیر،ص۸۳۹ (۲۸) جادوگر،کلیات منیر،ص۱۲۲

(۲۹) ژاں پال سارتر،''وجودیت اور انسان دوستی''(مترجم ظہور الحق شیخ)مشمولہ سارتر کے مضامین (مرتبہ فہیم شناس کاظمی) بک ٹائم،کراچی،۲۰۱۲ء،ص۲۲۳

(۳۰) میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا،کلیات منیر،ص۶۵۸

(۳۱) وجود کی اہمیت،کلیات منیر،ص۲۱۵ (۳۲) وجود کی اہمیت،کلیات منیر،ص۲۱۵